اردو افسانے میں ماضی کے سانحات اور اس کے نفسیاتی اثرات

خالد محمود سنجرانی
صدرِ شعبہ اردو
جی سی، یونیورسٹی لاہور۔

Abstract

This paper deals with the post-Traumatic Stress through the Urdu short story. The researcher explored the stress level of the character presented by the Manto, Ghulam Abbas, Mumtaz Mufti, Khalida Hussain, Anwar Sajjad, Jogindar Pal, Ram Laal and Jamila Hashmi.

انسان کی یہ فطرت ہے کہ اس کے سنگین تر گھاؤ وقت کے ہاتھوں مندمل ہو جاتے ہیں اور بعض اوقات ماضی کے سانحات اور حوادث وغیرہ کی یاد لمحہ بھر کے لیے انسان کو پریشانی میں مبتلا کر دیتی ہے۔ اس طرز کی پریشانی اور تشویش نفسیاتی بگاڑ کے زمرے میں نہیں آتی۔ اگر کوئی فرد ماضی کے حوادث کو پوری طرح دوبارہ ہوتا ہوا محسوس کرے اور اس کی تشویش نفسیاتی دوروں یا عجیب و غریب حرکات کی صورت اختیار کر جائے تو اس کیفیت کو بعد از صدمہ فشاری خلل کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اردو افسانے میں بھی اس طرز کے بگاڑ کے حامل چند کردار نظر آتے ہیں مگر ممتاز مفتی کے چند افسانے اس خلل کے حوالے سے اردو کے نمائندہ افسانے ہیں۔ ممتاز مفتی کا افسانہ ''گڑیا گھر'' اہمیت رکھتا ہے۔ افسانے کے عنوان ہی سے اندازہ ہوتا ہے کہ مفتی نے اسلام آباد کے ''پلاسٹک کلچر'' میں بسنے والے لوگوں کو افسانے کا موضوع بنایا ہے۔ افسانے میں مرکزی کردار فوضیہ بیگم کا ہے جو اسی ''پلاسٹک کلچر'' میں نرم نرم گڑیوں کی مانند زندگی بسر کرتی ہے اور طوفان، حوداث، پریشانیوں وغیرہ سے آشنائے محض تک نہیں ہوتی۔ افسانے میں ایسے طبقے کا احوال بیان کیا گیا ہے جو زندگی کی ناہمواریوں اور مصائب کے سامنے سینہ سپر ہونے کی قطعی صلاحتیں نہیں رکھتا جبکہ مفتی نے اس طبقے کے سرونٹ کواٹرز میں رہنے والے اس طبقے کی نشان دہی بھی کی ہے جو نہ صرف طوفانوں کو جھیلنے کا خوگر ہے بلکہ بپھرے ہوئے طوفان کا منہ موڑنے کی قدرت اور ہمت بھی رکھتا ہے۔ پر تعیش بنگلوں میں گڑیا کی مانند رہنے والے افراد اور سرونٹ کواٹرز میں رہنے والے ملازمین کی باہمی آویزش سے یہ افسانہ تخلیق کیا گیا ہے۔

ممتاز مفتی کے اس افسانے میں فوضیہ بیگم کا کردار ریل کے حادثے کو دوبارہ شدت سے محسوس کرتا ہے اور تحفظ، مدد کے لیے اپنے شوفر نوازش علی کو چیخ چیخ کر پکارتا ہے۔ ممتاز مفتی نے فوضیہ بیگم کے اس دورے کا پس منظر عمدگی سے بیان کیا ہے۔ ماضی کے سنگین واقعات کو دوبارہ محسوس کرنے کے حوالے سے ممتاز مفتی لکھتے ہیں:

"آدھی رات کے وقت سفید بنگلے کا وہ پر وقار سکوت ٹوٹ جاتا ہے اور بیگم کی خواب گاہ سے چیخوں کی آوازیں آنے لگتی ہیں۔ ننگی چیخیں۔ جیسے ریشم میں ملبوس گڑیا کپڑے پھاڑ کر مخملی کیس سے باہر نکل آئی ہو۔ اول تو شریف گھرانے کی بیگم کی خواب گاہ سے آدھی رات کے وقت چیخوں کا سنائی دینا اور پھر بیگم کا نوازش کو پکارنا۔ نوازش ایک معمولی ڈرائیور 'نوازش' بیگم کی آوازیوں گونجتی ہے جیسے وہ پکار رہی ہو، منتیں کر رہی ہو۔"[۱]

"گڑیا گھر" سے ممتاز مفتی کے فن نے موضوعاتی سطح پر ایک نیا موڑ لیا۔ پنجاب کے مختلف سکولوں میں معلّمی اور کراچی میں ابنِ انشا کے ساتھ کام کرنے کے بعد مفتی کا زندگی کا بڑا حصہ اسلام آباد میں بسر ہوا۔ وہاں پر انھیں بڑے بڑے سرکاری افسروں، وزراء اور اعلیٰ طبقے کی زندگی کے نہاں خانوں میں موجود نفسیاتی مسائل کو براہِ راست دیکھنے کا موقع ملا، یہی وجہ ہے کہ "گڑیا گھر" کے بعد "روغنی پتلے" وغیرہ کے افسانوں (بش اور بشری، روغنی پتلے ہانٹڈ مونا، ایلنز وغیرہ) میں مفتی نے اعلیٰ طبقے کے کرداروں کے روکھے پھیکے طرزِ حیات اور نفسیاتی مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ بعد از صدمہ فشاری خلل کے حوالے سے "گڑیا گھر" ممتاز مفتی کا نمائندہ ترین افسانہ ہے۔

غلام عباس نے اس افسانے میں نفسیاتی نظریات کی گرفت میں نہ آ سکنے والے ایک نفسیاتی الجھاؤ کو بڑی سادگی و دل نشینی کے انداز میں تخلیقی صلاحیت کی گرفت میں لیا ہے۔ افسانے میں مرکزی کردار اپنی بیوی کے وفات کے الم ناک حادثے میں اس قدر جکڑا ہوا دکھائی دیتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کی ہم شکل طوائف کے ہاں جانے لگتا ہے اور اس بات کا آرزومند ہوتا ہے کہ اس کی زندگی میں پھر سے وہ معمولات جاری ہو جائیں جو بیوی کی وفات سے قبل تھے۔

غلام عباس کے افسانوں میں اگر کہیں ابنارمل رویوں کا اظہار ہوا بھی ہے تو اتنے دھیمے انداز میں ہوا ہے کہ اس پر ابنارمل رویے کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ "اس کی بیوی" اس امر کی واضح مثال ہے۔ "خبطی ہے پورا، رات بھر اپنی مری ہوئی بیوی کی باتیں کر کے دماغ چاٹ گیا۔"[۲] غلام عباس کا یہ افسانہ نفسیات کے طے شدہ سائنسی اصولوں اور اصطلاحوں سے ماورا ہو کر ماضی کے صدمے سے جنم لینے والی تشویش کے ایک نئے رخ کو سامنے لاتا ہے۔

قیام پاکستان کے بعد سرحد کے دونوں اطراف میں جو بے رحمی، شقاوت اور وحشیانہ پن فسادات کی صورت میں نمایاں ہوا، اس کا زیادہ تر بار اردو افسانے نے اٹھایا۔ اس موضوع پر پاکستان و ہندوستان کی جامعات میں ڈاکٹریٹ کی سطح پر کام ہو چکا ہے اور اس موضوع پر اردو تنقید میں بھی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ہم ان تفصیلات میں نہیں جائیں گے۔ منٹو کا افسانہ "کھول دو" فسادات پر لکھے جانے والے افسانوں میں اس لیے بھی ممتاز ترین ہے کہ

اس میں منٹو نے نہ تو قتل و غارت گری کے منظر بیان کیے ہیں اور نہ ہی جلاؤ گھیراؤ کا منظر نامہ پیش کیا ہے۔منٹو نے فسادات کے بعد اپنوں کی بے رحمی صرف ایک ہی جملے میں سمو کہ رکھ دی ہے اور یہی جملہ سکینہ کے ماضی میں پیش آنے والے الم ناک حوادث کے نفسیاتی اثرات کو بھی ظاہر کرتا ہے۔''سکینہ کے مردہ جسم میں جنبش پیدا ہوئی۔ بے جان ہاتھوں سے اس نے ازار بند کھولا اور شلوار نیچے سرکا دی''۳؎ منٹو کا یہی جملہ اس عہد کے اجتماعی جنون اور وحشت سے بھری ہوئی ہوس ناکیوں کو بیان کرتا ہے۔سکینہ کے لیے اس کا ماضی اتنا مسخ کر دیا گیا کہ حال میں رہتے ہوئے بھی وہ ماضی کے سنگین حالات کی رو میں بہتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔سکینہ نہ تو ابنارمل ہے اور نہ ہی اس کا ردِ عمل، وہ ایک کچلی ہوئی مسخ شدہ روح کی پکار ہے جو اپنے عہد کے اجتماعی جنون سے ابھرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

جوگندر پال کے افسانے'' دریاؤں پیاس'' میں مرکزی کردار'' بے بے'' کی وساطت سے خطوں، یادوں، رشتوں اور مانوس در و دیوار اور گلی کوچوں کو اچانک چھوڑنے کے نفسیاتی عوامل کو نمایاں کیا ہے۔افسانے میں ''بے بے''، جس نے اپنی زندگی کا زیادہ عرصہ پاکستان میں بسر کیا تھا، فسادات اور اپنے اہل خانہ کے دباؤ کی وجہ سے ہندوستان چلی جاتی ہے مگر وہاں جا کر اسے اپنے ماضی کے واقعات، پرانی حویلی، مرحوم شوہر کی محبتیں، شکایتیں اور گلی کوچے اتنی شدت سے ستاتے ہیں کہ وہ ذہنی توازن کھو بیٹھتی ہے۔اس کے ہاتھوں میں پرانی حویلی کے ہر کمرے کی چابیاں یکے بعد دیگرے گھومتی رہتی ہیں، وہ خیالی دنیاؤں میں ہر کمرے کے قفل کھولتی ہوئی اور خود کلامی کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ہندوستان میں جا کر اسے بیٹے کا نیا بنگلہ میسر آتا ہے مگر وہ عالی شان بنگلے کے سبزہ زار میں اُگے پیڑ کے نیچے بیٹھ کر پرانی حویلی ہی میں کھوئی رہتی ہے اور ہواؤں سے باتیں کرتی رہتی ہے۔اسے بارہا یہ احساس ستاتا ہے کہ اس پرانی حویلی میں اس کا شوہر اسے بلا رہا ہے۔افسانے میں بے بے کا کردار ان تباہ شدہ لوگوں کی نمائندگی کرتا ہے جو بہ ظاہر استحکام سے بغل گیر ہیں مگر باطنی سطح پر ریزہ ریزہ ہو چکے ہیں۔

جوگندر پال کا یہ افسانہ نفسیاتی سطح پر ایک نیا انکشاف لیے ہوئے ہے کہ محض ماضی کے حوادث و سانحات ہی تشویشی خلل کا موجب نہیں ہوتے بلکہ سرزمینوں سے جدائی اور ماضی کے خوش کن لمحات کی یادیں بھی انتشار اور نفسیاتی عوارض کی وجہ بن سکتی ہیں۔ مذکورہ افسانے کا کردار'' بے بے'' اردو افسانوں کے ان کرداروں کی نمائندگی کرتا ہے جنھیں اپنی سرزمین، گلی کوچے اور در و دیوار سے ہجرت کے عمل نے نفسیاتی مریض بنا دیا۔ جوگندر پال بنیادی طور پر تجریدی اسلوب کے حامل افسانہ نگار ہیں مگر ان کا افسانہ'' دریاؤں پیاس'' تجریدیت کے خصائص کا آئینہ دار نہیں ہے۔اس افسانے میں جوگندر پال نے حقیقت نگاری کے اسلوب کو تھاما ہے۔شاید اس طرز کے کردار کی بنت کے لیے حقیقت نگاری کا انداز ہی موثر ثابت ہوتا ہے۔

آزادی کے بعد ہجرت کرنے والوں کی نفسیاتی صورتِ حال کا اظہار رام لعل کے افسانوں میں بھی نمایاں ہوا ہے۔اس حوالے سے'' اکھڑے ہوئے لوگ'' ان کا نمائندہ افسانہ ہے۔ افسانے میں ہجرت کرنے والے ایک ایسے خاندان کا ذکر ملتا ہے جو مغربی پنجاب سے بریلی میں آ کر آباد ہوتا ہے۔افسانے کا مرکزی کردار جو اس خاندان

کا سربراہ بھی ہے کی نفسیاتی کش مکش کو عمدہ انداز میں ظاہر کیا گیا ہے۔ اس کردار کو بریلی میں نیا گھر کسی غیر کا گھر محسوس ہوتا ہے اور اس میں اجنبیت کا احساس مرتے دم تک ختم نہیں ہوتا سابقہ زندگی، مغربی پنجاب کے کھیت، گلی کوچے اور تکیے کی یادیں اس بے قرار رکھتی ہیں۔ رام لعل نے اس افسانے میں ان کرداروں کو المیہ کی صورت دی ہے کہ جنہوں نے عملی طور پر ہجرت میں حصہ لیا تھا۔ افسانے کے مرکزی کردار کی تشویش اس وقت مزید بڑھ جاتی ہے جب وہ اجنبیت کا احساس اپنے ان بچوں میں نہیں پاتا جو ہندوستان میں آنے کے بعد پیدا اور جوان ہوئے تھے۔ ہجرت کے عمل سے جنم لینے والی تشویش اور فسادات کا منظران کے دیگر افسانوں بالخصوص ''ایک شہری پاکستان کا''، ''قبر''، ''نصیب جلی''، ''ایک اور پاکستانی''، ''اللہ کی بندی''، ''نئی فصل کا ایک ٹرک بھرے بازار میں''، ''تین بوڑھے''، ''میں زندہ رہوں گا''، ''تلاشِ گمشدہ'' اور ''زہر تھوڑا سا'' وغیرہ میں نمایاں طور پر ملتا ہے۔ مذکورہ بالا افسانوں کے کردار اپنی آبائی سرزمین کو مجبوراً ترک کرنے کے نہ صرف دکھ میں مبتلا نظر آتے ہیں بلکہ نئے علاقوں میں جاگزیں ہونے کی اجنبیت سے پیدا ہونے والی تشویش میں گھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔

انور سجاد جدید افسانہ نگاروں میں تجریدیت اور علامت نگاری کے ادبی تصورات کے حوالے سے نمایاں ہوئے۔ ان کے افسانوی کردار بے نام ہوتے ہوئے علامات کی صورت اختیار کر جاتے ہیں۔ انور سجاد اپنے بے نام کرداروں میں کسی طبقے، قوم یا خطے کی ذہنی، جسمانی اور نفسیاتی کیفیات سمو دیتے ہیں۔ فسادات کے موضوع پر ان کا افسانہ ''نہ مرنے والا'' نفسیاتی فضاؤں میں تشکیل پاتا ہوا نظر آتا ہے۔ انور سجاد نے اس افسانے میں اجتماعی جنون سے حوصلہ پا کر اپنے قریبی دوست کو قتل کرنے والے بے نام کردار کو اجاگر کیا ہے جو بالآخر اپنے اندر خیر کے احساسات کے ہاتھوں بری طرح تشویش میں مبتلا نظر آتا ہے۔ اسے چلتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ مقتول کا سایہ اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ گھر سے باہر گلی میں ٹہل رہا ہے۔ افسانے میں کردار کے احساسات کی علامتیں ماضی کے ایک حادثے اور سانحے کو ظاہر کرتی ہیں۔

خالدہ حسین جدید اردو افسانے کا اہم نام ہے۔ ان کے افسانے ''منی'' میں حاجن مائی، اماں اور پروین کے کردار ہجرت کے بعد اپنے پرانے گھر کو شدت سے یاد کرتے ہوئے اور نئے علاقے میں آنے کے بعد اجنبیت میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ خالدہ حسین نے ان تینوں کرداروں کے وسیلے سے ہجرت کے نفسیاتی اثرات کو اس افسانے میں نمایاں کیا ہے۔ اپنی آبائی سرزمین، گلی کوچے اور در و دیوار سے وابستہ ان مٹ یادیں ان کرداروں کی زندگی میں خلا پیدا کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ افسانے میں پروین کا کردار نفسیاتی الجھاؤ کے حوالے سے نہایت واضح ہے کہ ماضی کے خوش کن لمحات، مانوس چہرے اور گلیاں اسے بے طرح تشویش میں گھیرے رکھتی ہیں۔ اسے اپنے اندر وسیع خلا کا احساس ہوتا ہے اور ساتھ ساتھ اس کی یہ عادت بھی پختہ ہو جاتی ہے کہ اس نے کوئی اہم کام کرنا تھا جسے وہ بھول گئی ہے۔ افسانے میں پروین کا کردار اپنے پچھلے گھر کی یادوں کو دامن میں لیے ہوئے نئے علاقے میں آنے کی تشویش کو ابھارتا ہے۔ خالدہ حسین لکھتی ہیں:

''یہ لڑکی میرے اندر بھی ہے اور شاید مجھ سے باہر بھی، چنانچہ اس کے بے شمار وجود اندھیری رات میں اس کے گرد گھومنے لگے۔ بھورے رنگ کی بند کھڑکی کہیں اندھیروں سے نکل کر اس کی آنکھوں میں ثبت ہو جاتی ہے اور پھر لوٹ آتی ہے اسے یقین ہو گیا کہ مجھے وہاں جانا ہے اس لیے کہ وہاں بند کھڑکی میں کھڑی رو رہی ہوں۔''[۴]

جمیلہ ہاشمی اردو کی اہم ناول نگار ہونے کے ساتھ ساتھ اہم افسانہ نگار بھی ہیں۔ ان کے افسانے ''بن باس'' میں ''میں'' کے کردار کو ماضی کے حوادث اور سانحات تشویش میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ جمیلہ ہاشمی نے اس نسوانی کردار کو ۱۹۴۷ء کے فسادات کے تناظر میں تخلیق کیا ہے۔ یہ کردار اپنے اہلِ خانہ کی ہلاکتوں اور اپنی ذات کو مالِ غنیمت بن جانے کے شعور کو بڑے حوصلے سے برداشت کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ جمیلہ ہاشمی نے افسانے کی واحد متکلم کو انتہائی مضبوط اعصاب کی مالک خاتون کے طور پر پیش کیا ہے مگر جب اسے ماضی کی یادیں بے طرح ستاتی ہیں تو اس کی تمام تر حوصلہ مندی اور ضبط کی دیوار ریت کی دیوار ثابت ہوتی ہے۔ اسے ماضی کے حوادث یاد آتے ہیں۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی فسادات کے پرخوں لمحوں میں سفر کرتی ہے اور یہی تلخ یادیں اسے ازحد تشویش میں مبتلا کر دیتی ہے۔ جمیلہ ہاشمی نے اس افسانے میں جہاں مرکزی کردار کی ماضی کے ہولناک واقعات سے وابستہ تشویش کو نمایاں کیا ہے تو وہاں بزرگوں کے اس تیقّن کو ریزہ ریزہ ہوتا ہے ہوا دکھایا گیا کہ جس کی رو سے یہ فسادات چند ہی لمحوں میں سرد پڑنے کی امید وابستہ تھی۔ جمیلہ ہاشمی لکھتی ہیں:

''میں نے بابا کے سفید سر کو نالی کے کنارے پڑے دیکھا۔ ان کا جسم نالی میں تھا۔ دعا کے قبول ہونے کا وقت تھا بھلا؟ اماں کے سینے سے ایک چمکتا ہوا برچھا آر پار ہو گیا تھا اور وہ اسی جگہ گر گئیں جہاں انہوں نے نے خدا سے اپنی حفاظت اور عزت محفوظ رکھنے کی دعا مانگی تھی۔''[۵]

قرۃ العین حیدر کو آزادی کے بعد ہجرت کا وہ تجربہ حاصل ہوا کہ جس کے نہ ہونے کا طعنہ انتظار حسین نے بلراج مینرا کو دیا تھا۔ قرۃ العین حیدر سالوں پاکستان میں رہنے کے بعد ہندوستان چلی گئیں۔ ہجرت کے حالات وواقعات کی تلخ شدہ باقیات اور یادیں ہمیں قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں نظر نہیں آئیں۔ علاوہ ازیں، قرۃ العین حیدر کا تخلیقی مزاج عوامی سطح کا ہرگز نہیں ہے۔ آزادی کے دوران ہندوستان اور پاکستان کے گلی کوچوں، محلوں، چوراہوں، ریلوے اسٹیشنوں پر جو قیامت برپا ہوئی اس کی جھلک اور اس سے وابستہ خوشیاں یا غم عوامی سطح کے ہیں اور قرۃ العین حیدر کے ہاں یہ رنگ نظر نہیں آتا۔ البتہ عصمت چغتائی کے افسانے ''جہاں اور بھی ہیں'' میں ایک ضمنی کردار کی بارات ڈوب جانے کے حادثے کو یاد کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔

اردو افسانہ نگاروں نے ماضی کے تلخ حالات وحوادث سے وابستہ تشویش کو خالصتاً انفرادی سطح پر بھی محسوس کیا اور اجتماعی سطح پر بھی۔ انفرادی حوالوں سے عصمت چغتائی، ممتاز مفتی جبکہ اجتماعی حوالوں سے منٹو، رام لعل، جوگندر پال، جمیلہ ہاشمی، انور سجاد، خالدہ حسین وغیرہ کے نام سامنے آتے ہیں کہ جنہوں نے فرد کی تشویش کو ماضی کے

اہم المناک حوادث سے منسلک ہوتے ہوئے محسوس کیا اور اسے بیان بھی کیا۔

حوالہ جات:

۱۔ ممتاز مفتی: ''مفتیانے'' (افسانوی کلیات)، لاہور، فیروز سنز، ۱۹۸۹ء ص ۹۱۴۔
۲۔ غلام عباس: ''زندگی، نقاب، چہرے'' (افسانوی کلیات)، کراچی، دانیال، ۱۹۸۴ء، ص ۱۹۳۔
۳۔ منٹو، سعادت حسن: ''منٹو کہانیاں'' (افسانوی کلیات)، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء، ص ۱۴۔
۴۔ خالدہ حسین: ''پہچان''، کراچی، خالد پبلشرز، ۱۹۸۴ء، ص ۲۸۔
۵۔ جمیلہ ہاشمی: ''اپنا اپنا جہنم''، لاہور، ایسر، ص ۴۷۔

مآخذ:

۱۔ جمیلہ ہاشمی: ''اپنا اپنا جہنم''، لاہور، ایسر
۲۔ غلام عباس: ''زندگی، نقاب، چہرے'' (افسانوی کلیات)، کراچی، دانیال، ۱۹۸۴ء
۳۔ منٹو، سعادت حسن: ''منٹو کہانیاں'' (افسانوی کلیات)، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء
۴۔ خالدہ حسین: ''پہچان''، کراچی، خالد پبلشرز، ۱۹۸۴ء
۵۔ ممتاز مفتی: ''مفتیانے'' (افسانوی کلیات)، لاہور، فیروز سنز، ۱۹۸۹ء